

قرآن کا معاشی رجحان

پروفیسر شیخ محمد عثمان

○ موضوع کے متعلق اپنی گفتگو سے پہلے دو ایک باتیں تہدید کے طور پر عرض کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں۔

(۱)

پہلی اور نہایت اہم بات ذہن میں رکھنے کے قابل یہ ہے کہ اسلام کا معاشی یا سیاسی نظام اس کے اعتقادی، اخلاقی یا عباداتی نظام سے اپنی ہیئت میں ایک مختلف چیز ہے۔ قرآن مجید نے اعتقادی، اخلاقی یا عباداتی نظام کو بہت تفصیل سے اور مکمل حدود و ارجح کے ساتھ بیان کیا ہے، اور اس میں وقت کے ساتھ کسی بڑی اور بنیادی تبدیلی کی گنجائش نہیں رکھی؟ اس کا اعتقادی، اخلاقی اور عباداتی نظام غیر متغیر اور ابدی جزئیات پر استوار ہے اور وقت کا مروجہ ان میں رخنہ نہیں ڈال سکتا۔

اس کے برعکس جہاں تک معاشی یا سیاسی نظام کا تعلق ہے، وہ مروجہ معنوں میں شاید نظام، ہیں ہی نہیں اس لئے کہ قرآن مجید میں ان کی جزئیات یا ان کا مکمل حدود و ارجح بیان نہیں ہوا۔ معاشی یا سیاسی امور میں قرآن حکیم نے فقط سمت اور آخری مقاصد کا تعین کیا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں کچھ اہل یا بنیادی احکام دیئے گئے ہیں۔ تاہم ان کی جزئیات یا فرومات میں جانے سے قرآن نے گریز کیا ہے۔ اور جدید زمانے کے ان گنت پیچیدہ معاشی مسائل اور مباحث کے پیش نظر قرآن میں بیان کردہ احکام و اصول کو ہم زیادہ صحت کے ساتھ لیوں بیان کر سکتے ہیں کہ قرآن نے ان امور میں ہیں ایک رتدہ، ایک انداز نظر اور راہ عمل کے لئے ایک سمت دی ہے۔ انگریزی زبان میں آپ اسے (Attitude) سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ نظام نہیں۔ نظام کی روح ہے، منزل نہیں، نشان منزل ہے۔

اب تک کہی ہوئی بات کو قدس و ہر اتے ہوتے میں کہوں گا کہ دینی اسلام نے جہاں خلق کے لئے ہیں ایک منفرد اور جامع نظام اخلاق دیا ہے۔ اعتقاد کے معاملے میں ایک جامع اور مانع نظام مقاد دیا ہے اور عبادت کے واسطے ایک واضح اور مفصل نظام عبادات دیا ہے۔ وہ ان ملکیت کی سیاسی و معاشی تنظیم

کے لئے کوئی جامع اور مانع اور مفصل اور غیر متغیر سیاسی یا معاشی نظام نہیں دیا بلکہ سیاست کی کار فرماؤں کے لئے اور معاشرہ میں معاشی امور کو طے کرنے کی غرض سے چند ہدایات دی ہیں جن سے مجموعی طور پر ان امور میں قرآن کا رویہ (Attitude) ظاہر و مرتب ہوتا ہے۔

اس سے دو نتیجے لازماً اخذ ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ وقت کے ساتھ ساتھ بدلنے والے معاشرتی امور کو طے کرنے میں دین نے ہمیں خاصی آزادی اور خود مختاری بخشی ہے۔ قرآن حکیم کا ان معاملات کی تفصیل میں نہ جانے اور بے شمار جزئیات میں کامل سکوت اختیار کرنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ وقت کی ضروریات اور تقاضوں کے مطابق مگر قرآن مجید نے جو سمت اور انتہائی مقاصد متعین کئے ہیں۔ ان کے پیش نظر ہم ہر زمانے میں اپنا نظام معاش اور نظام سیاست ترتیب دینے کے خود متمم دار اور مجاز ہیں۔

دوم، اگر اور جب یہ تفادات یعنی وہ تفادات جو از روئے قرآن (مثلاً، معاشی نظام اور اخلاقی نظام میں سیت کے اعتبار سے پایا جاتا ہے، نفروں سے اوجھل ہو جائے اور وہ آزادی اور خود مختاری جو کمال حکمت کے ساتھ قرآن نے ہمیں اس ضمن میں دی ہے، سب کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کے نتیجے میں ذہنی انتشار اور نظری فساد اور دین سے بددلی اور بے یقینی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

اب میں ان ہدایات و احکام کو ایک ایک کر کے مگر مختصراً بیان کرتا ہوں جن سے مجموعی طور پر اسلام کے معاشی نظام کی روح آشکار اور مست متعین ہوتی ہے۔

(۲)

:- اگر ترتیب نزول کے اعتبار سے دیکھا جائے تو ابتدائی کئی سورتوں میں ایک بات **طعام مسکین** بڑی نمایاں نظر آتی ہے اور وہ ہے مسکین کو کھانا کھلانا۔ قرآن حکیم کے الفاظ میں

طعام مسکین کی تلقین عجب سادہ مگر پراثر اسلوب میں کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ الماعون کو پڑھئے۔

کل سات نہات چھوٹی چھوٹی آیات ہیں۔ ان میں سے پہلی تین یہ ہیں:-

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۚ فَذَلِكَ الَّذِي يَدْعُ الْيَتِيمَ ۚ وَلَا يَحْصُرُ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۚ

”تم نے دیکھا دین کو جھٹلاتا کون ہے؟ وہی جو یتیم کو پرے ہٹاتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی

گویا نکر دین کی ایک بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ سوسائٹی کے اُن افراد سے علا کوئی ہمدردی نہیں رکھتا جو اپنی ضروریات زندگی کو خود پوری کرنے سے قاصر یا محذور ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یتیموں کی دیکھ بھال اور غریبوں کی خوراک کا انتظام کرنا دیندار کی بنیادی خصوصیت ہے۔

سورہ بکد میں یہ بتانے کے بعد کہ نیکی کا راستہ دشوار گزار اور مشقت طلب ہے جن دونوں کے بیان کو سب پر مقدم رکھا ہے وہ یہ ہیں :-

(۱) غلام کو آزاد کرنا۔ اور (۲) کسی بھوکے کو کھانا کھلانا۔ فرمایا :-

وَمَا أَزِرُكَ مَا اتَّعَبْتَهُ ۚ فَلَوْلَا رَحْمَةُ رَبِّكَ لَأَكِيدُكَ ۖ فَكُلْ ۖ وَأَوْطِئْ عَامِرًا فِي يَوْمٍ ذُو مَعَادٍ ۚ
ذَا مَقُورَتِهِ ۚ أَوْ مُكِينًا ۚ ذَا مَشْرَبٍ ۚ

”اور آپ جانتے ہیں (براہِ حق کی) گھاٹی کیا ہے؟ (غلام کی) گردن آزاد کرنا یا بھوک کے روز کسی رشتہ دارِ یتیم یا خاک نشین مسکین کو کھانا کھلانا“

سورہ انفجر میں انسانی زندگی کی ایک گرہ بڑی عمدگی سے کھولی گئی ہے۔ فرمایا، انسان کو جب کبھی آزمائش میں ڈالا جاتا ہے۔ اور پھر اسے عزت اور نعمت بخشی جاتی ہے تو وہ کہتا ہے ”پروردگار نے مجھے عزت بخشی ہے“ لیکن اگر وہ یوں آزمائش میں ڈال دیا جائے کہ اس پر رزق تنگ ہو جائے تو وہ بلبلا اٹھتا ہے۔ اور کہتا ہے ”میرے رب نے مجھے ذلیل کر لیا“ اس موقع پر قرآن حکیم نے جو جواب ایسے شخص کو دیا ہے، وہ غور طلب ہے۔ قرآن کہتا ہے ہم نے کیا کیا ہے؟ یہ تو خود تمہارے اپنے کثرت ہیں۔ تم ہی نے یتیم کی عزت نہ کی اور مسکین کو کھانا کھلانے پر توجہ نہ دی (اب ہمیں کیا کہنے ہوا!)۔

كَلَّا بَلْ لَّا تَتَذَكَّرُونَ الْيَتِيمَ ۚ وَلَا تَحْقُقُونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْيَتِيمِ ۚ

”ہم نے ذلیل کیا؟ ہرگز نہیں بلکہ تم ہی یتیم کی عزت نہیں کرتے تھے اور نہ مسکین کو کھانا کھلانے کی ترغیب دیتے تھے۔“

اس سورہ مبارکہ انفجر کو غور سے پڑھئے تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یتیم یتیم اور طعام مسکین کیسی بنیادی نیکی ہے۔ اور اس پر افراد و اقوام کی فلاح و عدم فلاح کا کتنا انحصار ہے۔ یہاں نہایت غیر مبہم لفظوں میں یہ حقیقت بیان ہوئی ہے کہ جو افراد اور معاشرے اپنے یتیموں اور مسکینوں کی معقولیت اور عزت کے ساتھ دیکھ بھال کرتے ہیں وہ (خلا کی طرف سے) اس دنیا میں عزت و

نعمت کے حق دار ٹھہرتے ہیں اور جو معاشرے اس بات سے غفلت برتتے ہیں، خدا ان کی معیشت کو تنگ اور خدا ان کو ذلیل کر دیتا ہے۔

سورہ دھڑ میں نیک افراد کی یوں تعریف کی گئی ہے کہ یہ لوگ مسکینوں، یتیموں اور اسیروں کو کھانا

کھلاتے ہیں۔ اور ان سے شکر گزاری کی توقع نہیں رکھتے۔

وَلْيَطْعُونِ الطَّعَامَ عَلَى حَبِّهِمْ مَسْكِينًا وَيَتِيمًا وَاسْتِئْزَاهُ إِنَّمَا لَطْعُكُمْ لَوْجُهُ اللَّهُ لَا تُزِيدُ
مِنْكُمْ حِزًّا وَلَا تَشْكُرُوا ه (۹-۸)

”اور وہ مسکین اور یتیم اور تیدی کو کھانا اس کی محبت میں کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں ہم تو اللہ کی

خوش نویدی کے لئے ایسا کرتے ہیں۔ ہم تم سے کوئی صلہ نہیں چاہتے اور نہ شکر گزاری۔“

آیات بالا قریب قریب سبھی اس دنیا اور اس کے حالات سے متعلق تھیں۔ مگر سورہ المائدہ میں

آخرت کے پس منظر میں اس حکم کو بیان کیا گیا ہے۔ اصحاب جنت گناہ گاروں سے پوچھتے ہیں کہ کس چیز

نے تمہیں دوزخ میں لا ڈالا ہے، مجربین جواب دیتے ہیں: ”ہم نہ تو نماز پڑھتے تھے اور نہ مسکینوں کو کھانا

کھلاتے تھے۔“

فَأَنذَرْنَاكَ مِنَ الْمُصَلِّينَ ه وَلَمْ نَكُ لَطْعُمًا لِمَسْكِينٍ ه

”ہم نہ تو نماز ادا کرتے تھے اور نہ ہم مسکین کو کھانا کھلاتے تھے۔“

اس موضوع پر قرآن حکیم میں متعدد آیات اور ہیں مگر مندرجہ آیات کے مطالعے سے یہ بات

آپ پر بخوبی واضح ہو گئی ہوگی کہ طعام مسکین، اس دنیا اور آخرت کے اعتبار سے کیسی نیکی ہے اور قرآن

حکیم نے کس کس طرح اس نیکی کی ہم کو ترغیب و تلقین کی ہے۔

(۳)

زکوٰۃ پر باقاعدہ روزہ اور بعد میں (زیادہ تر مدنی دور میں) دیا گیا ہے لیکن کئی دور کی

حق معلوم

سورتوں میں ایک اصول اور بیان ہوا ہے جس کا ذکر یہاں ضروری ہے۔ سورہ

المعارج میں ایک جگہ وہ اوصاف و محاسن تفصیل مذکور ہیں جن سے مسلمان کا کردار تشکیل پاتا ہے اور

اپنے معاہدوں کے پابند، امانتوں کے پاسدار، اپنی نمازوں کے محافظ، اپنی جنسی خواہشات کو قابو میں

رکھنے والے اور روزہ گزار، سخت تقویٰ کے حامل ہیں۔ یہاں نماز کے بعد دوسرے درجے پر ان کا یہ

وصف بیان ہوا ہے کہ یہ ہیں وہ لوگ جن کے مال و دولت میں سائل اور محروم کا ایک جانا پہچانا سہی ہے،
الفاظ ملاحظہ ہوں۔

وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ

”اور وہ لوگ جن کے اموال میں سائل اور محروم افراد کا ایک جانا پہچانا سہی ہے“

طعام مسکین اور تحریم قیم کے ضمن میں بات یہاں تک پہنچی تھی کہ نیک دل مسلمان اپنے معاشرہ کے سب سے
اور غریب افراد کی دیکھ بھال کر کے ان پر احسان نہیں دھرتے، یہ نیک ان کے جذبہ ایمان اور محبت الہی کا
تقاضا ہے۔ لیکن اس آیت میں بات کو کچھ آگے بڑھایا گیا ہے، جذبہ ہمدردی اور محبت کی بنیاد سہی،
میں بدل گئی ہے۔ اچھے انسان اور مسلمان وہ ہیں جو اپنی کمائی میں سے سائل اور محروم کا سہی، جانتے اور
تسلیم کرتے ہیں۔

اس سہی کی اہمیت کا اندازہ یوں بھی لگایا جاسکتا ہے کہ بالکل ہی بات سورۃ الذرّیٰ میں
مسلمانوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے دہرائی گئی ہے۔

وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ

”اور ان کے مال و دولت میں سائل اور محروم کا سہی ہے“

(۴)

غالباً اسی سہی کو آگے چل کر زکوٰۃ کا نام دیا گیا ہے۔ زکوٰۃ کا فریضہ اس قدر اہم اور اس
زکوٰۃ کے متعلق معلومات اتنی عام ہیں کہ اس کو یہاں زیادہ تفصیل سے بیان کرنا شاید غیر ضروری
ہوگا۔ تاہم اس ضمن میں دو باتیں مختصراً عرض کی جاتی ہیں۔

المحمد سے والانس تک قرآن حکیم میں زکوٰۃ کا حکم اور اس کی تلقین بے شمار جگہوں پر ہوتی ہے
اکثر اوقات نماز اور زکوٰۃ کا ذکر اکٹھا ہے اور بیشتر نماز پہلے۔ اور زکوٰۃ اس کے بعد مذکور ہے۔ لیکن دو
ایک مقامات پر اس ترتیب کو یوں بھی بدلا گیا ہے کہ زکوٰۃ مقدم اور صلوٰۃ مؤخر الذکر ہو گئی ہے۔

زکوٰۃ کی صورت قریب قریب وہی ہے جو آج تمام ترقی یافتہ ممالک میں بعض کمیونسٹ ملکوں
کو چھوڑ کر ٹیکس اور سوپر ٹیکس کی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ٹیکس سالانہ آمدنی پر لیا جاتا ہے اور زکوٰۃ
محض آمدنی پر نہیں بلکہ مجموعہ شہرہ مالی پر مع انچیز راستہ، مندرجہ بالا اور دوسری اجناس کے وصول کی جاتی ہے

جس طرح دوسری قوموں میں ٹیکس اور سوپر ٹیکس وغیرہ کی شرح اور ان سے متعلق ضابطے وقتاً فوقتاً بدل سکتے ہیں اور بدلتے رہتے ہیں۔ اس طرح زکوٰۃ کی شرح کا بھی حالات اور ضروریات کے مطابق کم یا زیادہ مقرر کئے جانے کا حجاز موجود ہے۔ قرآن حکیم نے زکوٰۃ کی جو قطعی شرح مقرر نہیں کی۔ اس کی بھی یہی حکمت سمجھ میں آتی ہے۔

(۵)

زکوٰۃ کی حیثیت کم و بیش سرکاری ٹیکس کی سی ہے مگر جیسا کہ دوسری قوموں پر ایک صدقات و انفاق نظر ڈالنے سے ثابت ہوتا ہے، اچھے متول لوگوں میں سرکاری لین دین کے علاوہ بھی

اپنی دولت کو رفاہ عامہ پر خرچ کرنے کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ اور قرآن حکیم چاہتا ہے کہ یہ جذبہ مسلمانوں میں بدرجہ اتم موجود ہو۔ امریکہ اور یورپ کے بے شمار دولت مند افراد اسکولوں، کالجوں، شفا خانوں، کتب خانوں، محتاج گھروں اور دوسرے لائقہ اور نافی کاموں پر لاکھوں، کم ڈیڑوں ڈال دیا اور پونڈ خرچ کرتے ہیں۔ فریڈ نائڈلین اور راک فیلر نائڈلین قسم کے رفاہی ادارے تو اپنے ملک کی سرحدوں سے نکل کر غیر ملک میں بھی اپنے انفاق کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ (یہاں ان اداروں کے سیاسی مقاصد سے بحث نہیں)۔ خود اپنے شہر لاہور میں دیکھئے۔ یہ دیال سنگھ کالج، دیال سنگھ لائبریری، گنگا رام ہسپتال، رام دیوی شفا خانہ قسم کے ادارے جن سے ہزارہ افراد علم و صحت کے شعبوں میں فیض اٹھاتے ہیں، کیا ہیں؟ ٹیکس اور زکوٰۃ سے بڑھ کر خرچ کرنے والے فراخ دلوں کے یادگار نقوش!

قرآن حکیم نے صدقات اور انفاق پر بڑا زور دیا ہے۔ کہیں یہ فرمایا ہے کہ جب تک تم اپنا مال و زر جسے تم بہت چاہتے ہو، خدا کے راستے اور رفاہ عامہ میں خرچ نہ کرو گے تم نیکی کو نہیں پاسکتے، گویا نیکی راہِ حق میں دل کھول کر خرچ کرنا لازم و ملزوم ہیں۔ کہیں ایسے انفاق اور خرچ کو اللہ کے ذمے و قرضہ قرار دیا اور فرمایا: ”تم اے مسلمانو! اللہ کو قرض دو، کیونکہ یہ بہت ہی اچھا قرضہ ہے“ کہیں مستحق افراد معاشرہ خصوصاً رشتہ داروں اور بھائی بندوں کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ: ”تم جو کچھ ان پر خرچ کرو، وہ اعلیٰ نیکیوں میں شمار ہوگا اور ذی استطاعت ہونے پر تم اس سے دریغ نہ کرو“ (۲۶۱-۲۶۲)

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ زکوٰۃ ہی کو دوسرے مقامات اور لفظوں میں صدقہ و انفاق کہا گیا ہے، اور ان کی اپنی الگ کوئی شرعی اصل نہیں۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے میں سورۃ بقرہ کی ۲۷۱ اور آیت کے متعلق جسے کا ترجمہ درج کرتا ہوں جس سے اندازہ ہوگا کہ قرآن حکیم زکوٰۃ سے الگ اس

سلوک کا غیر مبہم الفاظ میں تقاضا کرتا ہے۔

”نیکی یہ تو نہیں کرتے (وقتِ عبادت، مشرق اور مغرب کی سمت منہ پھیر لو۔ نیکی تو اسے حاصل ہوتی ہے جو اللہ، دوزخ، آخر، فرشتوں، کتابوں اور نبیوں پر ایمان لاتا ہے اور رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائیکوں اور غلاموں کی آزادی پر اپنا مال خرچ کرتا ہے اور نماز ادا کرتا اور زکوٰۃ ادا کرتا ہے۔“

آپ نے دیکھا یہاں زکوٰۃ کی ادائیگی کا ذکر الگ ہے اور رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں پر مال خرچ کرنے کا بیان الگ اور مقدم ہے۔

(۶)

قرآن مجید نے ایک طرف تو نیکی کے کاموں پر روپیہ خرچ کرنے کی زبردست تلقین کی ہے، **اِکْتَثَارِ زَرْعٍ** اور دوسری طرف ان لوگوں کو خبردار کیا ہے جو روپے پر سانپ بن کر بیٹھتے ہیں یا حج زر کے غیر انسانی جذبے سے مغلوب ہو کر ہر طرف اور ہر طریق سے دولت سیٹھنے میں لگے رہتے ہیں۔ اس قسم کا انتباہ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر ہے۔ یہاں صرف دو آیتیں درج کرتا ہوں۔ سورہ بقرہ میں ایک جگہ خرچ کا حکم دیتے ہوئے ذی استطاعت ہونے کے باوجود خرچ نہ کرنے کو مصلحت اور خودکشی سے تعبیر کیا ہے، **نَسْرَ مَا يَدْعُو بِسَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ** (۱۹۵) ”اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو“

اس ضمن میں سورہ توبہ کی ۲۴ ویں اور ۲۵ ویں آیاتِ حریف آخر کی حیثیت رکھتی ہیں، جو لوگ دولت کو چھپاتے اور روکے رکھتے ہیں اور نیک کاموں پر خرچ نہیں کرتے، خدا نے ان کو بدترین عجز قرار دیا ہے، اور انہیں ان کے نہایت خوفناک انجام سے متنبہ فرمایا ہے:

”اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے رہتے ہیں اور اس کو اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے، تو ان کو دردناک عذاب کی خبر سنا دے۔ جس دن دوزخ کی آگ میں اُس سونے، چاندی کو تپایا جائے گا، پھر اُس سے ان کے ماتھے اور ان کی کمرے اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی اور ان سے کہا جائے گا، یہ ہے جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا، سو اُس کا مزہ چکھو جو تم جمع کرتے تھے۔“

(۷)

سود کے متعلق کافی عرصے سے ہمارے ان ایک بحث چل رہی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال **حُرْمَتِ سَوَد** ہے کہ صرف اس روپے پر منافع لینا حرام ہے جسے کوئی ضرورت مند نے کراپنی ضرورت پُر نچ کر ڈالے اور اگر کوئی شخص ادھر ادھر سے روپیہ اکٹھا کر کے کسی نفع بخش تجارت یا صنعت میں لگاتا ہے تو روپیہ دینے والے بھی اس کے منافع میں شریک ہو سکتے ہیں۔ اکثر علماء کا خیال ہے کہ سود کی ہر صورت اور شکل از روئے قرآن حرام ہے۔ یہاں میں اس بحث میں بڑے بغیر اس بات پر زور دینا چاہتا ہوں، کہ سود خوری کی جس قدر مذمت قرآن حکیم میں ہے اور سود خور کو حتیٰ تعالیٰ نے جس طرح للکارا ہے، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسلام سا ہو کارہ کے نظام کا سخت ترین دشمن ہے خواہ وہ نظام انڈیہ کے درمیان ہو یا اقوام کے مابین۔ بغیر تجارت یا محنت کے محض روپیہ دے کر اُس کا ڈیوٹھا، دگنا، ہگنا وصول کرنے کو قرآن نے ظلمِ عظیم قرار دیا ہے اور مسلمانوں کو ہدایت کی ہے کہ جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا مگر اب تم اس راہ سے باز آ جاؤ، جن کے ذمے قرض ہے، اُن سے نرمی کا برتاؤ کرو یا معاف کر دو یا آسان قسطوں میں اپنی اصل رقم واپس لے لو اور جو لوگ ایسا نہیں کرتے اُن کو خبردار کیا ہے کہ وہ خدا اور رسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جائیں شاید ہی کسی اور معاشرتی جرم پر اللہ تعالیٰ نے مجرموں کو یوں للکارا ہو اور ان کو دعویت مبارزت دی ہو۔ سود کو حرام قرار دینے کے بعد فرمایا:-

فَإِنْ لَّمْ تَقْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَبْ مِنْ اللَّهِ وَرَسُولِهِ ه (۲۹)

”اور اگر تم ایسا نہیں کرتے تو اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ“

سود کی قطعی حرمت اپنے آخری تجزیے میں معاشی ظلم و استحصال کی روک تھام اور معاشرتی انصاف کی بحال و قیام ہے۔ سود ظلم ہے اور حرمتِ سود اس ظلم کی بیخ کنی۔

(۸)

اب دو ہدایات بیان کرنے باقی رہ گئے ہیں۔ ایک کا تعلق معاشیاتِ گردشِ زر کا زریں اصول کے اُس اہم نظریے سے ہے جس کی رُو سے بیشتر ماہرین یہ خیال کرتے ہیں کہ دولت کو قوم کے ہر طبقے میں گردش کرنا چاہیے۔ اس سے مجموعی قومی سرمائے میں اضافہ ہوتا ہے اور ہر کسی کی ضروریات پوری ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے برعکس اگر دولت چند ہاتھوں میں کسی ایک

طبقے میں گھومتی رہے تو مجموعی قومی سرمایہ میں امکانی ترقی نہیں ہوتی اور قوم کے بعض طبقے اپنی ضروریات سے محروم رہ جاتے ہیں۔ قرآن حکیم نے قریب قریب وہی الفاظ استعمال کئے ہیں جو بعض جدید معاشین نے اس قانون یا اصول معاش کو بیان کرتے ہوئے استعمال کئے ہیں۔

رسول اکرم کا دستور تھا کہ غزوات کے بعد مالی نصیحت کو مبادین میں برا بھلا تقسیم فرما دیا کرتے تھے۔ اس سے چند سالوں میں ایک طبقے کے پاس دولت جمع ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہوا تو حق تعالیٰ نے نئے یعنی اس مال کی تقسیم کا جو عہد رسالت میں مسلمانوں کو پہن لڑے دشمنوں سے ہاتھ آجاتا تھا۔ ایک نیا ضابطہ مقرر کیا۔ فرمایا:-

”جو مال اہل دیہات سے اللہ نے اپنے رسول کو بغیر لڑائی کے دلایا ہے، وہ اللہ اور رسول اور رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے۔“

اور اس حکم کی حکمت یوں بیان فرمائی:-

كَيْ لَا يَكُونَتْ دُولَةٌ بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مَشْكُورَةٌ (۱۰)

یعنی اس قسم کے مال غنیمت میں یتیموں، مسکینوں اور مسافروں وغیرہ کو (جو ظاہر ہے جہاد و قتال میں شریک نہ ہوتے تھے) اس لئے شریک کیا جا رہا ہے۔

”تاکہ دولت تم میں سے امیروں ہی کے درمیان نہ گھومتی رہے“ (سورہ حشر: ۷)

(۹)

اب آخری ہدایت کی طرف آئیے۔ اَلْعَفْوُ کے معنی ہیں، جو کچھ ضروریات سے ناامد ہو۔ قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ اور دیگر اہل عرب اپنی تسلی اور حصول علم کی خاطر رسول اکرم سے کئی قسم کے سوالات پوچھا کرتے تھے۔ ان ہی میں سے ایک اہم استفسار جس کا ذکر ایک سے زیادہ بار ہوا ہے یہ ہے کہ ہم کتنا خرچ کریں؟۔ سورہ بقرہ کی ۲۱۵ سے ۲۲۲ تک کی آیات بیشتر ان ہی سوالوں کا جواب ہیں۔ ان میں سے پہلی آیت مبارکہ یوں ہے (ترجمہ)

”آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ کہہ دیں: والدین، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں پر جو بھی تم خرچ کر سکو۔“

یہ ۲۱۵ ویں آیت ہے، ۲۱۸ ویں آیت میں پھر اس سوال کو دہرایا گیا ہے۔ مگر اب کے جواب پہلے سے نسبتاً بڑے مطالبے پر مشتمل ہے۔ فرمایا: اَلْعَفْوُ مِمَّا دَانَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ اللّٰهِ (ترجمہ)

”آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ کہہ دیں: اپنی ضروریات سے جو کچھ بچ رہے۔“

(۱۰)

یہ ہیں وہ معاشی ضابطے جن پر قرآن حکیم نے زور دیا ہے۔ اب ذرا غور فرمائیے کہ اس تمام حکم و تلقین اذِ منہ و انتباہ کو نظر میں رکھتے ہوئے معاشی مسائل کے بارے میں جو تصویر قرآنی تعلیمات کی ابھرتی ہے، کیا وہ واضح اور غیر مبہم طور پر اس تصور سے ملتی جلتی نہیں ہے، جسے عرف عام میں جمہوری اشتراکیت یا اشتراکی جمہوریت کہتے ہیں۔ معاشرے کے مفلوک الحال لوگوں کی اخلاقی اور نفسیاتی سطح پر مناسب دیکھ بھال، کمائے ہوئے اور جمع شدہ مال کا ایک حصہ خزانہ عامہ میں دینے کا اٹل حکم، سرکاری ٹیکس کے علاوہ دلی کھول کر نفاذ عامہ پر خرچ کرنے کی تلقین و ترغیب، سود کی سختی سے ممانعت، جمع زر کے رجحان کی شدید مخالفت، روپے کا ساسے معاشرے میں بہیم محو گردش رہنے پر زور، اپنی ضروریات سے زائد کو راہِ حق میں خرچ کر ڈالنے کی تحریک، یہ سب باتیں اس امر پر قطعی دلالت کرتی ہیں کہ اسلام گہرے اشتراکی رجحانات رکھتا ہے، یہ درست ہے کہ تنہا ’العفو‘ پر زور دینا اور اس ایک پہلو کو اسلامی معاشرے کی معاشی اساس قرار دینا راۃ اعتدال سے بھٹ جانے کے مترادف ہو گا لیکن ’العفو‘ کے علاوہ جو احکام و اصول قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں، ذرا آپ سوچئے، کہ ان کا الگ الگ اور مجموعی رجحان اور زور کس طرف ہے۔

اور پھر یہ بھی سوچئے کہ آزادی کے بعد سے جو معاشی قوتیں ہمارے ہاں برسرِ کار آئی ہیں اور ابھی ہیں ان کا رجحان اور زور کس طرف ہے؟ ۱۹۶۳ء کے اوائل میں سٹیٹ بینک اور صنعت کاری میں امداد دینے والے سرکاری اداروں کی کارگزاری کا جائزہ لینے والے کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی تھی اور اس پر اخبارات کے تبصرے بھی۔ ان کا حاصل یہ تھا کہ ملک کی بیشتر دولتیں ساڑھے سو گھرانوں اور مل مالکوں کے ہاتھوں میں سمٹ کر رہ گئی ہے۔ متذکرہ رپورٹ نے یہی بتایا کہ ۳۱ مارچ ۱۹۶۲ء تک سرکاری اداروں کی طرف سے جو قرضے دیئے گئے، ان کا تقریباً ۹۰ فی صد صرف ۲۳۳ کھاتوں میں گیا۔ اور یہ قرضے دس لاکھ سے پچاس لاکھ تک کے تھے۔ اس کے مقابلہ میں تقریباً ۷۲ ہزار چھوٹے صنعت کاروں کے حصے میں کل قرضہ کا صرف ۹ فی صد آیا۔ اور ان میں سے کوئی قرضہ پچیس ہزار سے زیادہ کا نہ تھا۔ اس صورتِ حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے ’پاکستان ٹائمز‘ نے اپنی اشاعت مورخہ ۱ جنوری ۱۹۶۳ء کے ادارے میں لکھا:-

”ان حالات میں اس پر تعجب نہیں کرنا چاہئے کہ چھوٹے اور کمزور صنعت کاروں اور

ہر طرح کی مشکلات کا سامنا ہے اور بڑے اور زیادہ دسیوں والے کارخانہ دار پھولے ہوئے کٹڑے کی طرح دن رات ترقی کر رہے ہیں۔ صرف یہی نہیں، دولت و اقتدار کی ہوس نے اب انہیں ایک نئی راہ سمجھائی ہے، وہ ٹرسٹوں، کڑٹلوں اور اجارہ داریوں کی تنظیم میں ایک دوسرے کے شریک تعاون ہو رہے ہیں تاکہ بازار اور بھاد مکمل طور سے ان کے اختیار میں ہو۔ ظاہر ہے کہ اس بڑھتے ہوئے رجحان کو روکنے کی مناسب تدبیر نہ کی گئی تو گنتی کے چند گھرانے ملک کی دولت کا غالب حصہ ہتھیا لیں گے اور ملک کی معاشیات پر عملاً ان کا قبضہ ہو جائے گا۔

۱۹۶۳ء سے اب تک حالات کچھ زیادہ نہیں بدلے۔ میرا مطلب ہے کہ دولت کے سنبھلے کار حجان کم نہیں ہوا۔ البتہ حال ہی میں حکومت نے جو ”ان ویسٹ منٹ کارپوریشن“ بنائی ہے، توقع کرنی چاہیے کہ اس کی بدولت اس رجحان کو مزید بڑھنے سے روکنا ممکن ہو گا۔

(۱۱)

مضمون ختم کرنے سے پہلے اس موضوع کے تعلق میں پیدا ہونے والے دو میں اہم سوالوں سے متناہی ضروری خیال کرتا ہوں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ جب قرآن انفرادی اور نجی ملکیت کا حامی ہے تو کیا اس سے لازماً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ ذرائع دولت کو قومی ملکیت میں لینے کا مخالف ہے؟ میرا جواب نفی میں ہے۔ دلیل یہ ہے کہ جب قرآن نازل ہوا۔ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے اسلامی معاشرہ کی تشکیل فرمائی۔ اس وقت انفرادی ملکیت اور قومی ملکیت کا وہ تنازعہ ہی پیدا نہ ہوا تھا جو اب تقریباً تمام ترقی پذیر ملکوں میں بالخصوص اور ساری دنیا میں بالعموم معاشی تنظیم کا نہایت اہم مسئلہ ہے۔ یہ بات اصول کے طور پر یہیں خوب اچھی سمجھ لی جانی چاہیے کہ ایسے وہ تمام تمدنی اور معاشرتی مسائل جو خالصتاً جدید دور کی پیداوار ہیں۔ ان کے بارے میں نظری اور عملی فیصلے خود ہماری صواب و دید کا مسئلہ ہیں۔ یہاں قرآنی تعلیمات کی روح فقط ہماری رہنا ہونی چاہیے، اس کے علاوہ فقر و ردا یات کا کوئی طے شدہ اصول یا بزرگان سلف کا کوئی مخصوص طرز عمل ہمارے لئے حجت نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ ایسا ہر طے شدہ اصول یا طرز عمل ان بزرگوں نے قرآن کی روح کو سامنے رکھ کر اپنے مخصوص ماحول اور اپنے مخصوص مسائل کو حل کرنے کی خاطر اختیار کیا تھا۔ لہذا اپنے مخصوص ماحول اور اپنے مخصوص مسائل کو حل کرنے کے لئے ہم ان کے فیصلوں یا اصولوں کے پابند کیوں ہو سکتے ہیں، ہم تو

صرف اُس تکنیک سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جسے خود ہمارے بزرگوں نے اپنے زمانے میں برتا۔ اور وہ تکنیک یہ ہے کہ کو قرآن کی روح کے پیش نظر ہر دور میں اُس کے مسائل اس کے اپنے تقاضوں اور ضرورتوں اور انسانی شعور اور قومی امنگوں کے مطابق حل کئے جائیں۔

ذاتی ملکیت کا اصول اپنی جگہ پر، مگر اُس کو کس حد تک محدود کرنا ہے اور جدید دور کے لائحہ عمل و ذرائع دولت کو کب کہاں تک اور کیسے قومی ملکیت میں رکھنا یا لینا ہے۔ اس کا فیصلہ خود ہمیں کرنا ہے۔ ہم بہ حیثیت مسلمان جو بھی فیصلہ کریں گے ہمارے دور میں وہ اسلامی فیصلہ ہو گا جس کو بعد میں آنے والی نسلیں اسی تکنیک کے مطابق جب اور جیسا چاہیں بدلنے کی مجاز ہوں گی اور ان کے زمانے میں ان کے فیصلے بھی اسلامی ہوں گے خواہ وہ ہم سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں۔

اس ضمن میں میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ جدید دور کے مسلمان ملکوں اور معاشرہوں کو انفرادی ملکیت کا ادارہ ضرور زندہ و برقرار رکھنا چاہیے لیکن اسے اس طرح اور اس حد تک محدود کر دینا چاہیے کہ وہ قومی ترقی اور عوام کی خوش حالی اور بہتر معیار زندگی میں حائل نہ ہو۔ مثال کے طور پر آج کل تمام عالم اسلام میں مکانوں کی قلت کا مسئلہ درپیش ہے، بیشتر لوگ بے گھر ہیں اور چند لوگوں کے پاس بڑے بڑے محل، وسیع دعرین کوٹھیاں اور درجنوں مکان ہیں جن سے زیادہ سے زیادہ کرایہ حاصل کرنے کا رجحان عام ہے اس سے یہ ثابت ہوا کہ ذاتی مکان یا رہائشی جائیداد کا ادارہ اپنی معصوم اور منسلکی سرحدوں کو چھلانگ کر ظلم و جور اور استحصال و معصیت کی راہ میں بہت آگے نکل گیا ہے۔ لہذا اگر کوئی اسلامی ملک اس قسم کا قانون نافذ کر دے کہ کوئی گھرانہ ایک سے زیادہ مکان کا مالک نہیں رہ سکتا تو اس دور میں یہ عین اسلامی قانون ہو گا۔ یہی صورت زمین کی ملکیت کی ہے۔ اسلامی معاشرہ میں کسی فرد یا گھرانے کی اپنی زمین، مالکانہ حقوق کے

ساتھ ہو سکتی ہے لیکن حد ملکیت مقرر کرنے کا اختیار پھر حکومت یا معاشرے یا دوسرے نفلوں میں جھوڑے مسلمانوں کے پاس محفوظ ہے۔ اگر کسی اسلامی ملک میں زمین و افراد آبادی کم ہے یا مزارعین کا طبقہ مقابلہ کمزور تعداد میں ہے تو قی کن پانی گھرانہ حد ملکیت زیادہ ہو سکتی ہے اگر صورت اس سے برعکس ہو تو حد ملکیت کم یا کم سے کم ہونا چاہیے۔ مثال کے طور پر ہمارے ان چند سال پہلے تک زمین کی ملکیت کا مسئلہ جدید معاشی اصلاحات کی ذیل میں نہیں آیا تھا۔ اگرچہ ملک کا ایک طبقہ اس کا شدید احساس رکھتا تھا اور اس نے زرعی اصلاحات کا ڈول بھی ڈالا تھا۔ مگر اس کو قانونی صورت صدر ایوب کے دور میں حاصل ہوئی۔ صدر ایوب نے جو زرعی اصلاحات نافذ کی ہیں۔ اس میں حد ملکیت بالکل واضح ہے۔ بعض لوگ اس حد کو زیادہ یا بہت زیادہ خیال کرتے ہیں،

ابھی چند روز پہلے (۲۰ فروری ۲۰۲۶ء) کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ مغربی پاکستان کسان کمیٹی کے ارکان نے اپنی ایک قرارداد کے ذریعے مطالبہ کیا ہے کہ حد ملکیت پانچ سو ایکڑ سے گھٹا کر ایک سو ایکڑ کر دی جائے۔

غرض یہ اور اس قسم کے دوسرے تمام سوالات آج ہمیں خود حل کرنا ہیں۔ ان معاملات میں زمانہ سلف کی مثالیں اور نظیریں اور دلیلیں پیش کر کے نئے اقدامات کو خلاف اسلام ثابت کرنا درست طرز عمل نہیں، قرآن کی روح عدل و انصاف، ترقی و ارتقاء اور عوامی فلاح و بہبود کا مسلسل تقاضا کرتی ہے۔ اب اگر یہ روح زمینداروں کے خاتمے یا حد ملکیت کے لئے ۱۰۰ ایکڑ یا ۵۰ ایکڑ یا پچیس ایکڑ کا تقاضا کرتی ہے اور انسانی شعور و عوامی احساسات اور مسلمان دانش و دین کی بصیرت اس کی تائید کرتی ہے تو ہمارے دور میں یہی اسلامی معاشی نظام قرار پائے گا۔

(۱۲)

دوسرا سوال یہ ہے کہ اسلام کے معاشی ضوابط کی روح کو یعنی عدل و انصاف اور حسن اعتدال کے جدید تقاضوں کو اسلامی مملکتوں میں کیوں کر جاری و نافذ کیا جاسکتا ہے؟ زیادہ واضح لفظوں میں یہ سوال یوں ہے کہ کیا مطلوبہ معاشی اصلاحات پُر امن ذرائع یعنی تلقین و ترغیب اور جمہوری انداز میں لائے عامہ ہوا کر کے حاصل کی جائیں یا انقلابی ذرائع کو بروئے کار لاکر؟ قرآن پُر امن ذرائع کو اور تعلیم و تربیت اور تبلیغ و اشاعت کے وسیلوں کو ترجیح دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ ان وسائل کو پورے خلوص، صبر، حسن تدبیر اور مستقل مزاجی کے ساتھ کام میں لایا جائے۔ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی اس امر کی شاہدِ عادل ہے لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ قرآن حد درجہ صلح و آشتی اور امن و سلامتی کا پیغام بر ہونے کے باوجود جب دیکھتا ہے کہ پانی سر سے گزر رہا ہے اور ظلم و زیادتی کی قوتیں امن و آشتی کی زبان سمجھنے سے انکاری ہیں تو وہ طاقت اور قوت کے استعمال کو خارج از حوزہ نہیں سمجھتا۔ قوت سے پہلے ترغیب و اشاعت کا طویل اور صبر آزماء اور قرآن کی تعلیم اور اسوۂ رسول ہے۔ لیکن جب اور جہاں ترغیب و اشاعت کے تمام ذرائع ناکام ہو جائیں تو قرآن کا فیصلہ قتلے کو روکنے کے لئے قتل کے حق میں ہے (اَلْفَتْحَةُ اَشَدُّ مِنْ الْقَتْلِ) رسول اکرم کی مدنی زندگی اور حضرت ابو بکر صدیق کا طرز عمل جب انہوں نے اُن مسلمان قبائل کے خلاف قوت استعمال کرنے کا فیصلہ کیا جو زکوٰۃ ادا نہ کرنے اور انصاف کے تقاضوں سے روگردانی پر اڑے بیٹھے تھے۔ اس ضمن میں نوثر اور دانی دلیل مہیا کرتے ہیں۔

(۱۳)

مضمون کے آخری پرکھ میں محمد مصطفیٰ ﷺ کے اس میں معاشی نابہواریاں

اور بے اعتدالیاں بہت دیر تک اپنی گرفت مضبوط نہیں رکھ سکتیں۔ انسانی شعور روز بروز حسّاس اور تیز تر ہوتا جا رہا ہے۔ اُدھر چینی اور روس جیسے ملکوں کے نظری اور عملی اثرات دور دور تک پھیلتے جا رہے ہیں، ایسے میں جس ملک کے دانش ور اور اہل سیاست خود اپنے ہاتھوں سے اپنی معاشی عمارت کی مددتی نہیں کریں گے، ان کے لئے یہ کام وقت کا بہاد اور تاریخ کی قوتیں انجام دیں گی۔ اور اگر پاکستان کے اندر یہ کام وقت کے بہاد اور تاریخ کی قوتوں پر چھوڑ دیا گیا اور خود ہم نے اس عظیم ترین فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کی تو اس کے نتیجے میں اسلام اور دہ نظریہ جس کے زور پر پاکستان حاصل ہوا ہے، خطرہ میں پڑ جائے گا۔ لہذا دیانت اور دانش مندی دونوں کا تقاضا ہے کہ اپنے ہاں کی معاشی ناہمواریوں کو دور کرنے کا بندوبست ہم خود کریں، اور اسلام کی مدد اور اسلام کے نام پر کریں تاکہ نظریہ پاکستان اور ہماری قومیت کی بناء مضبوط ہو اور مخالف قوتوں کو سر اٹھانے اور ہمارے عظیم مقاصد کو نقصان پہنچانے کا موقع ہاتھ نہ آئے۔

شاید ۱۹۴۴ عیسوی کا ذکر ہے، حیدر آباد مندر میں جمعیت العلماء کا اجلاس تھا۔ اس میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کا ایک مضمون مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی نے پڑھا تھا، جس کا موضوع زکوٰۃ تھا۔ مولانا سندھی کے اس مضمون کا خلاصہ یہ تھا کہ زکوٰۃ مکہ مکرمہ ہی میں فرض ہو گئی تھی، لیکن اس کی شرح معین نہ تھی، اس میں حکمت یہ تھی کہ مکہ مکرمہ میں بیت المال نہیں تھا، جس سے کہ مسلمانوں کی عام ضرورتیں پوری کی جاتیں، چنانچہ حسب ضرورت زکوٰۃ نکالی جاتی تھی، لیکن جب مدینہ منورہ میں بیت المال قائم ہو گیا تو زکوٰۃ کی معین شرح مقرر کر دی گئی، اور یہ اُس وقت کی ضروریات کے لئے کافی تھی، بے شک زکوٰۃ کی یہ شرح مسنون ہے، یعنی اس سے یہ کم نہیں ہو سکتی، لیکن یہ کہ ضرورت کے وقت اس میں اضافہ نہیں ہو سکتا، صحیح نہیں۔

(ضیاء)